

بابِ اسرار: ترکِ فکشن میں مذہبی فکر اور صوفیانہ روایت

Bab-i Esrar: Religious Thought and Sufi Tradition in Turkish Fiction

DOI: <https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2024.080435>

حافظ محمد عبدالقدوس

Hafiz Muhammad Abdul Qudoos
PhD Scholar, Department of Urdu
Government College University, Lahore

ڈاکٹر فرزانہ ریاض

Dr Farzana Riaz
Assistant Professor, Department of Urdu
Government College University, Lahore

Abstract:

This study critically examines the mystical and philosophical dimensions in Bab-i Esrar by Ahmet Ümit, with a particular focus on the representation of the spiritual bond between Jalaluddin Rumi and Shams Tabrizi. Through a textual analysis of key dialogues and narrative sequences, the research explores how the novel employs Sufi concepts—Sharia, Tariqa, Marifa, and Haqiqa—to construct a layered spiritual journey. The character of Karen, a Western non-Muslim woman, serves as the narrative's lens, shifting from an external investigative mission to an inner quest for truth. The analysis highlights the symbolic role of trials, spiritual guidance, and transformative encounters that bridge historical mysticism with contemporary seekers of divine love. The study also addresses how the novel's portrayal of Sufi thought aligns with broader mystical traditions, emphasizing spiritual awakening, the continuity of divine presence, and the transformative role of the spiritual master. The findings contribute to the understanding of contemporary Turkish mystical fiction and its intertextual engagement with classical Sufi heritage.

Keywords:

Ahmet Ümit, Bab-i Esrar, Sufism, Jalaluddin Rumi, Shams Tabrizi, Turkish Fiction, Sharia, Tariqa, Marifa, Haqiqa

ترک فکشن کی معاصر روایات میں احمدت اُمت کا ناول ”بابِ اسرار“ ایک ایسی ادبی تخلیق ہے جو کرائم تھرلر،

تاریخی بیانیہ اور صوفیانہ فکر کو یکجا کرنے کی منفرد مثال پیش کرتا ہے۔ یہ ناول محض ایک سنسنی خیز کہانی نہیں بلکہ ایک فکری و روحانی جستجو ہے، جس میں مذہبی افکار، تصوف کی کلاسیکی تعلیمات اور روحانی علامتوں کو نہایت مہارت سے فلکشن کے تانے بانے میں پرویا گیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی اور شمس تبریز کے تعلق کی صوفیانہ معنویت کو مرکزی پس منظر بناتے ہوئے، مصنف نے قاری کو مادی حقیقت اور باطنی سچائی کے مابین موجود اس باریک مگر گہری لکیر کی سیر کرائی ہے جو صوفی روایت میں عشقِ حقیقی، فنا و بقا، اور انسانِ کامل کے تصورات سے جڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، جدید ترک معاشرے کے سیکولر مزاج اور مذہبی روحانیت کے امتزاج کو کہانی کی ساخت میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری نہ صرف ماضی کی روحانی میراث سے آشنا ہوتا ہے بلکہ اپنے عہد کے فکری سوالات کے جواب بھی تلاش کرنے لگتا ہے۔

ترک فلکشن میں مذہبی فکر اور صوفیانہ روایت کا امتزاج کوئی نیا رجحان نہیں، تاہم اہمیت کے ”باب اسرار“ نے اس امتزاج کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے، جہاں تاریخ، فلسفہ، اور کرائم بیانیہ ایک ہی فکری دھارے میں رواں دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول کا بنیادی پس منظر مولانا جلال الدین رومی اور شمس تبریز کے درمیان وہ روحانی تعلق ہے جس نے صوفی فکر میں عشقِ حقیقی، روحانی تربیت، اور وحدت الوجود کے نظریے کو ایک زندہ اور متحرک معنویت عطا کی۔ مصنف نے اس تعلق کو نہ صرف علامتی اور بیانیہ سطح پر برتا ہے بلکہ جدید معاشرتی اور فکری چیلنجز کے تناظر میں بھی اس کی ازسرنو تعبیر پیش کی ہے۔ ”باب اسرار“ میں مذہبی افکار کو صرف روایتی بیانیے تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ انہیں سیکولر معاشرت کی فکری بحثوں، مغربی عقلیت پسندی، اور فرد کی داخلی روحانی جستجو کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ یہی پہلو اس ناول کو محض ایک ادبی تخلیق نہیں بلکہ ایک فکری و تحقیقی متن بنا دیتا ہے، جو قاری کو ماضی و حال کی فکری کڑیوں کو ازسرنو دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

”باب اسرار“ (Bab-1 Esrar) پہلی بار ۲۰۰۸ء میں ترکی زبان میں شائع ہوا اور بعد ازاں انگریزی میں The Dervish Gate اور اردو میں ”باب اسرار“ کے عنوان سے ترجمہ ہوا۔ یہ ناول بظاہر ایک معاصر کرائم تھرلر ہے، مگر اس کی اصل روح صوفیانہ فکر اور تاریخی بیانیے میں پیوست ہے۔ کہانی کی بنیاد دو متوازی اسرار پر ہے: ایک، سات صدیوں پر محیط شمس تبریز کے قتل کا معما، اور دوسرا، موجودہ دور کے قونیہ میں پیش آنے والی ایک آتش زدگی اور اس میں ہونے والی ہلاکت کا راز۔ ان دونوں کہانیوں کو جوڑنے والا مرکزی کردار کیرن کیمیا ہے۔ ایک برطانوی نژاد انشورنس انویسٹی گیٹر، جو بظاہر ایک حادثے کی تحقیق کے لیے قونیہ آتی ہے، مگر آہستہ آہستہ ایک ایسے روحانی سفر میں داخل ہو جاتی ہے جو اسے اپنی گم شدہ شناخت، ماضی کے روحانی ورثے، اور تصوف کے ابدی حقائق سے آشنا کرتا ہے۔

ناول میں کیرن کی تحقیق خواہوں، کشف، اور ماورائی تجربات کے ذریعے صدیوں پر محیط ایک روحانی داستان سے جڑتی ہے، جس میں مولانا جلال الدین رومی اور شمس تبریز کا تعلق مرکزی مقام رکھتا ہے۔ پلاٹ میں مادی اور روحانی

دنیا کے بیانے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر قاری کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ حقیقت صرف ظاہری واقعات تک محدود نہیں، بلکہ ایک باطنی جہان بھی ہے جس تک رسائی عشق، معرفت، اور روحانی تربیت سے ممکن ہے۔ یہ منفرد ساخت ناول کو محض تفریحی ادب نہیں بلکہ فکری و روحانی دریافت کا ذریعہ بناتی ہے۔ ناول میں مادی اور روحانی دنیا کی کشمکش ایک مرکزی فکری دھارے کے طور پر ابھرتی ہے۔ ناول کے اہم مکالمات میں یہ تصور نہ صرف صوفیانہ فکر کی بنیاد بیان کرتا ہے بلکہ قاری کو اس سوال پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ حقیقت کا اصل چہرہ کس سطح پر پوشیدہ ہے — محسوسات کی دنیا میں یا وجدان کی گہرائیوں میں۔ مصنف نے اس فرق کو ایک نہایت پُر اثر تمثیل کے ذریعے واضح کیا ہے:

”دو دنیا میں ہیں، پہلی دنیا مادی دنیا ہے جب کہ دوسری روحانی دنیا ہے۔ مادی دنیا دن کے وقت کی طرح ہے، جو کچھ بھی ہو رہا ہوتا ہے، تم اسے صاف دیکھ رہی ہوتی ہو اور اسے سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے، لیکن جہاں تک روحانی دنیا کا تعلق ہے، یہ رات سے مشابہ ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے تمہیں اپنی روح کی روشنیاں جلانی پڑتی ہیں۔“ (۱)

یہ تمثیل مادی دنیا کو ”دن“ اور روحانی دنیا کو ”رات“ سے تشبیہ دے کر اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ ظاہری حقائق اگرچہ آسانی سے نظر آجاتے ہیں، لیکن ان کی تہہ میں پوشیدہ اصل حقیقت تک رسائی صرف باطنی روشنی کے ذریعے ممکن ہے۔ صوفیانہ فکر میں اس ”باطنی روشنی“ کو بصیرت یا کشف کہا جاتا ہے، جو ذکر، ریاضت اور قلبی صفائی سے پیدا ہوتی ہے۔ Kara (۲۰۱۷ء) کے مطابق، باب اسرار میں یہ دو جہان "Mystical Dualities" کے تصور کو مجسم کرتے ہیں، جہاں دن روشنی، وضاحت اور مادی تجربے کی علامت ہے، جبکہ رات سکوت، اسرار اور باطن میں چھپی ہوئی سچائی کی نمائندگی کرتی ہے۔ مادی دنیا کا فہم براہ راست حسی مشاہدے سے ممکن ہے، مگر روحانی دنیا کا ادراک صرف اندرونی بیداری اور قلبی پاکیزگی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (۲) یہی مفہوم مولانا رومیؒ کی تعلیمات میں بھی ملتا ہے، جہاں حقیقت کے باطن تک رسائی کے لیے قلب کو ”نور باطن“ سے منور کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ Tüfekcioğlu کے مطابق، باب اسرار میں یہ دو جہان ایک فکری پل کی مانند ہیں جو قاری کو محض ظاہری واقعات سے آگے بڑھا کر ایک ”اعلیٰ صداقت“ کی تلاش پر آمادہ کرتے ہیں اور یہ جستجو صرف روحانی بیداری سے ممکن ہے۔ (۳) اس طرح یہ ناول محض ایک فکشن نہیں رہتا بلکہ ایک مکمل روحانی سفر کا بیانیہ بن جاتا ہے۔

روحانی سفر کی تمثیل صرف مادی اور روحانی جہانوں کے فرق تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس میں صوفیانہ رسومات، خاص طور پر ”سماع“ کو ایک علامتی اور روحانی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جیسے پہلے حصے میں روحانی بیداری کو باطن کی روشنی سے تعبیر کیا گیا، اسی طرح یہاں سماع کو ایک ایسی عبادت قرار دیا گیا ہے جو محض رسم نہیں بلکہ ایک نئے جنم، تزکیہ نفس اور الوہی حقیقت سے قربت کا ذریعہ ہے:

”سماع عبادت کی ایک قسم ہے۔ مسلمانوں کی روایتی عبادت نماز کی طرح۔۔۔ سماع موت کا اظہار نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ زندگی کی علامت ہے۔ میرا مطلب ہے دوبارہ پیدائش کی۔ اپنے گناہوں سے نجات، طبعی دنیا سے پرے سچ کی بادشاہی میں منتقل ہونے کی۔ سماع کے دوران درویش تنورے کے اوپر سیاہ چٹے پہننے ہیں جو خرقة کہلاتے ہیں اور یہ سیاہ چوغہ دراصل درویش کی قبر ہوتا ہے۔“ (۴)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ بابِ اسرار میں سماع کو موت کی بجائے زندگی اور روحانی تجدید کی علامت بنایا گیا ہے۔ سیاہ خرقة درویش کی ”قبر“ کی علامت ہے، جو مادی وجود کے خاتمے اور باطنی وجود کی بیداری کا استعارہ ہے۔ یہ تصور مولانا رومیؒ کی اس تعلیم سے ہم آہنگ ہے کہ روحانی زندگی کا آغاز تب ہوتا ہے جب انسان اپنی نفسانی خواہشات اور مادی جکڑ بندیوں کو ”دفن“ کر کے اپنے باطن کو الوہی نور کے لیے کھول دیتا ہے۔ Kara کے مطابق، ناول میں سماع کو ایک Ritual of Transcendence کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو نہ صرف روحانی سفر کی یاد دہانی ہے بلکہ قاری کو اس حقیقت کی طرف مائل کرتا ہے کہ ”موت“ دراصل ایک بلند تر حیات میں داخلے کا دروازہ ہے:

”سماع درویشوں کے لیے محض ایک رقص نہیں بلکہ ایک عبادتی کیفیت ہے، جو دنیاوی علاقے سے انقطاع اور روحانی بیداری کی طرف ایک علامتی سفر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں پہنا جانے والا سیاہ خرقة گویا قبر کا کفن ہے اور جب یہ اتارا جاتا ہے تو یہ دوبارہ حیات پانے کا استعارہ بن جاتا ہے۔“ (۵)

سماع کے ذریعے روحانی بیداری اور پیدائش ثانی کے تصور کو بیان کرنے کے بعد بابِ اسرار میں اس صوفیانہ عمل کے چار مدارج کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو سالک کے سفر حقیقت کے بنیادی ستون ہیں۔ یہ مدارج صرف حرکی یا موسیقائی ترتیب نہیں بلکہ ایک باطنی ارتقاء کی نمائندگی کرتے ہیں، جو سالک کو شریعت سے شروع کر کے حقیقت تک پہنچاتے ہیں:

”چار مختلف موسیقائی حرکتیں جن کے دوران چار مختلف سلام پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلا دروازہ شریعت کا ہے۔۔۔ دوسرا در طریقہ ہے یہ رومیؒ صوفیوں کی داخلی صوفیانہ جہت ہے۔۔۔ تیسرا معرفت کا دروازہ ہے، حتمی سچائی کو جان لیا ہو۔۔۔ چوتھا دروازہ حقیقت ہے۔ یہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر نروان شدہ دانش تقسیم کرتا ہے۔ اپنا دایاں ہاتھ اوپر کھول کر درویش خدا کی رحمتیں وصول کرتا ہے اور بائیں ہاتھ زمین کی طرف کھول کر درویش اپنی بدھی بانٹتا ہے اور وہ یہ رحمتیں لوگوں پر نچھاور کرتا ہے۔ یوں درویش پیدائش ثانی کا دائرہ مکمل کرتا

ہے۔“ (۶)

یہ اقتباس صوفیانہ تربیت کے چار روحانی دروازوں کی وضاحت کرتا ہے، جو دراصل سالک کے باطنی سفر کے سنگِ میل ہیں۔ پہلا دروازہ ”شریعت“ ہے جو ظاہری احکام اور دینی قوانین کی پابندی کی علامت ہے۔ دوسرا دروازہ ”طریقت“ ہے، جو روحانی استاد کی رہنمائی اور عملی صوفیانہ مشقوں کے ذریعے داخلی ترقی کے پر زور دیتا ہے۔ تیسرا ”معرفت“ ہے، جس میں سالک حقیقتِ مطلقہ کا ذاتی ادراک حاصل کر لیتا ہے۔ چوتھا اور آخری ”حقیقت“ ہے، جہاں سالک اپنی ذات کو فنا کر کے کائناتی حقیقت میں ضم ہو جاتا ہے اور رحمتِ الہی کا وسیلہ بن کر مخلوق تک فیض پہنچاتا ہے۔ یہی ترتیب اور علامتی معانی ثانوی ماخذ میں بھی واضح کیے گئے ہیں، جیسا کہ Kara لکھتے ہیں:

”سماں میں چار سلام خدا کی طرف سفر کے چار مراحل کی علامت ہیں: شریعت (الہی قانون)، طریقت (راہ)، معرفت (علم)، اور حقیقت (سچائی)۔ آخری مرحلے میں درویش اپنا دایاں ہاتھ آسمان کی طرف کھول کر خدا کی برکتیں وصول کرتا ہے اور بائیں ہاتھ زمین کی طرف موڑ کر ان برکتوں کو دنیا کے ساتھ بانٹتا ہے۔“ (۷)

اس طرح بابِ اسرار میں مذکور چار دروازوں کا تصور نہ صرف صوفیانہ روایت کا تسلسل ہے بلکہ اس کی روحانی، علامتی اور عملی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ Kara کی تحقیق اس بات کو مستند بناتی ہے کہ یہ مدارج صرف فکشن کا حصہ نہیں بلکہ ایک صوفیانہ روحانی ڈھانچے کی عکاسی ہیں، جو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ صوفیانہ استعاروں کے ذریعے مادی اور روحانی حقیقت کے تعلق کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ان استعاروں میں ”نہ“ (بانسری) کا تصور خصوصی اہمیت رکھتا ہے، جو مولانا رومیؒ کی مثنوی کا ایک مرکزی استعارہ بھی ہے۔ یہاں ”نہ“ انسان کی روحانی بیداری اور خدا سے وصال کی تمثیل ہے، جہاں اس کے اندر پھونک مارنا گویا خدا کی روح پھونکنے کے مترادف ہے:

”ہمارے خدا نے پیغمبر آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ وہ نے کا موازنہ اپنے اعتقاد کے مطابق پہلے انسان سے کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام شروع میں ایک بت کی مانند بے جان تھے، وہ اس وقت بیدار ہوئے جب خدا نے ناک کے راستے ان میں زندگی کی روح پھونکی۔ بالکل نے کی طرح، جب ایک ماہر نے میں پھونک مارتا ہے تو یہ معمولی سرکنڈے سے بنا ساز انتہائی شاندار اور حسین مقدس آواز پیدا کرتا ہے، ایک انسان کی طرح جس نے اپنے اندر خدا کی روح کو دریافت کر لیا ہو۔“ (۸)

انسان کی تخلیق اور روحانی بیداری کو ”نہ“ کے استعارے سے جوڑا گیا ہے۔ صوفیانہ فکر میں نے کی بانسری کٹی ہوئی سرکنڈے کی علامت ہے، جو اپنی اصل (سرکنڈے کے جنگل) سے جدا ہو کر فراق اور جدائی کا نوحہ کرتی ہے۔ جب

اس کے اندر ہوا پھونکی جاتی ہے، تو وہ خاموش اور بے جان مادہ ایک زندہ، نغمہ ریز اور دل موہ لینے والا ساز بن جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی محض مٹی کا پیکر ہے، جب تک کہ اس میں خدا کی طرف سے روح پھونک نہ دی جائے۔ Kara کے مطابق:

”یہ صوفیانہ تمثیل آدم علیہ السلام کی تخلیق اور انسان کی روحانی تکمیل کو ایک ہی کڑی میں جوڑتی ہے، اور اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ اصل حیات مادی وجود سے نہیں بلکہ روحِ الہی سے آتی ہے۔ بابِ اسرار میں اس تصور کا استعمال قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ انسان کا اصل مقصود اپنے اندر اس الہی روح کو پہچانا اور اسے جلا دینا ہے۔“ (۹)

بابِ اسرار میں صوفیانہ فکر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انسانی روح کا سفر ایک مسلسل ارتقائی عمل کے طور پر دکھایا گیا ہے، جو مادی حقیقت سے باطنی حقیقت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ یہ سفر محض فکری یا عقلی جستجو نہیں، بلکہ عملی اور روحانی تربیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس تربیت کا مقصد انسان کو اس مقام تک پہنچانا ہے جہاں وہ اپنے وجود کی گہرائیوں میں جھانک کر اپنے اور خالق کے درمیان فاصلے کو مٹا دے۔ اس عمل میں چار بڑے مراحل یا ”دروازے“ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جو سالک کو ایک باطنی سفر پر گامزن کرتے ہیں۔ ان مراحل کو درویشوں کے ”سماع“ کی حرکات میں نہ صرف علامتی طور پر پیش کیا جاتا ہے بلکہ جسمانی تجربے کی صورت میں محسوس بھی کروایا جاتا ہے:

”روحانی طور پر ایک خرد مند وجود جو خدا تک پہنچ گیا ہو۔ وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو خدا کے ساتھ ایک ہو چکا ہو۔ یہ مشکل ترین کام ہے جس سے کرنے کا کوئی تہیہ کرے۔ انسان کو چار مختلف منازل یا دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ درویشوں کی سماع کے دوران ان دروازوں سے گزرنے کے عمل کو پیش کیا جاتا ہے۔“ (۱۰)

یہ اقتباس صوفیانہ تربیت اور روحانی ارتقاء کی اس ساختیاتی ترتیب کو بیان کرتا ہے جس میں سالک کو چار دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے: صوفیانہ راستہ چار بنیادی منازل پر مشتمل ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک سالک کو روحانی کمال کی طرف لے جاتی ہے۔ پہلی منزل شریعت ہے، جہاں ظاہری احکام و قوانین کی سختی سے پیروی کے ذریعے کردار کی اصلاح اور تطہیر کی جاتی ہے۔ دوسری منزل طریقت ہے، جس میں سالک مخصوص روحانی مشقوں، ذکر اور مسلسل مجاہدے کے ذریعے اپنے نفس کو قابو میں لاتا اور اسے پاکیزہ بناتا ہے۔ تیسری منزل معرفت ہے، جہاں سالک باطنی علم، کشف اور قربِ الہی کا ذاتی وجود انی تجربہ حاصل کرتا ہے، اور حقیقت کے اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے۔ آخر میں چوتھی اور سب سے بلند منزل حقیقت ہے، جو حتمی اتحاد اور فنا فی اللہ کا مقام ہے، جہاں سالک کا وجود مکمل طور پر حق کی تجلی کا مظہر بن جاتا ہے اور وہ صرف اور صرف الہی حقیقت میں فنا ہو جاتا ہے۔

سماع میں یہ چار مراحل جسمانی حرکات، موسیقی اور وجدانی کیفیت کے امتزاج سے مجسم کیے جاتے ہیں۔

درویش کا مسلسل گھومنا وقت اور مکان کی حدود سے ماورا ہو کر روح کے ازلی سفر کی نمائندگی کرتا ہے، اور ہاتھوں کا اوپر اور نیچے ہونا رحمتِ الہی کے نزول اور اس کے بندوں تک پہنچنے کی علامت ہے۔ اس پورے عمل میں موسیقی محض فن نہیں بلکہ عبادت کا ذریعہ ہے، جو دل کی گہرائیوں کو جھنجھوڑ کر روح کو مزید بیدار کرتی ہے۔ یہی ترتیب Schimmel نے اپنی تصنیف Mystical Dimensions of Islam میں بیان کی ہے، جہاں وہ صوفی راستے کو ”چار منازل پر مشتمل روحانی سفر“ قرار دیتی ہیں۔ ان کے مطابق ہر مرحلے میں سالک کو اپنی روح کو مزید پاکیزہ کرنا اور خدا کے قریب تر ہونا ضروری ہے:

”صوفیانہ راستہ عموماً چار منازل پر مشتمل ایک سفر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے: مقدس شریعت کی پابندی (شریعت)، روحانی تربیت و ریاضت کا راستہ (طریقت)، الہی اسرار کے عرفان کا درجہ (معرفت)، اور آخر میں حقیقت کا شعور (حقیقت)۔ ہر مرحلہ طالبِ حق سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی روح کو پاکیزہ کرے اور خدا کے قریب تر ہو جائے۔“ (۱۱)

صوفیانہ روایت میں خدا کی حقیقت کو سمجھنے کا عمل ایک طویل اور پیچیدہ باطنی سفر ہے، جس میں سالک ظاہری احکام کی پیروی سے شروع کرتا ہے اور باطن کے عمیق ترین اسرار تک پہنچتا ہے۔ اس سفر میں انسان صرف اعمالِ عبادت تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنے دل اور ذہن کے آئینے کو اس قدر صاف کرتا ہے کہ وہ حقیقت کو اس کی اصل صورت میں دیکھ سکے۔ صوفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ الہی حقیقت کو سمجھنے کے لیے محض عقلی دلیل یا ظاہری علم کافی نہیں، بلکہ باطن کی پاکیزگی، نظر کی درستی اور دل کی صفائی ضروری ہے۔ خدا ایک ایسی ہمہ گیر وحدت ہے جو اپنے اندر جلال اور جمال دونوں کی صفات کو سمیٹے ہوئے ہے، مگر انسان اسے اپنی داخلی کیفیت کے مطابق دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کرنے والے کو اسی وحدت میں رحمت دکھائی دیتی ہے اور ظلم پسند کو قہر۔ اس زاویہ نظر کی تبدیلی سالک کے پورے فکری و روحانی سفر کا حاصل ہے۔ پچھلے مباحث میں ہم نے ”سما“ اور ”چار دروازوں“ (شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت) کا ذکر کیا، جو عملی منازل کا بیان ہیں۔ اب اس اقتباس میں صوفیانہ فکر کا وہ انتہائی نکتہ سامنے آتا ہے، جو وحدتِ حق اور انسانی ادراک کے باہمی تعلق کو واضح کرتا ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ خدا کیا ہے، بلکہ یہ کہ ہم اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں:

”شاہ نسیم نے اپنی سنہری آنکھیں میرے بابا کے چہرے پر جماتے ہوئے دیر تک بغور انہیں دیکھا۔ تم غلطی پر ہو۔ وہ بولے اور پھر نرمی سے سر ہلایا۔ خدا عفو و رحم سے بالاتر ہے، اور بے شک وہ قہر اور سزا سے بھی بالاتر ہے۔ وہ یہ سب کچھ ہے؛ یہ سب کچھ اس میں یکجا ہے۔ واحد ہونے کا مطلب اشیا کی بوقلمونی کو گنوائے بغیر۔ انہیں یکساں بنائے اور باہم مدغم کیے بغیر۔ انہیں اپنی ذات میں سمیٹ لینا ہے۔ چونکہ ہر وہ شے جو وجود رکھتی ہے، اس کا کوئی نہ کوئی

مطلب اور مقصد ہے۔ اکثر اوقات سوال یہ نہیں ہوتا کہ خدا کیا ہے بلکہ یہ کہ ہم اس میں کیا دیکھتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کو اس میں رحم نظر آتا ہے اور ظالموں کو قہر؛ ذہین لوگ اس میں عقل ڈھونڈتے ہیں اور کم عقل اندھا اعتقاد؛ اہل دانش کو علم و سائنس جبکہ سادہ لوح کو معجزے نظر آتے ہیں۔“ (۱۲)

یہ اقتباس تین بنیادی فکری جہات پر روشنی ڈالتا ہے۔ پہلی یہ کہ خدا جلال (قہر) اور جمال (رحمت) دونوں صفات سے ماورا ہے اور ان کا جامع بھی۔ صوفیانہ فکر کے مطابق الہی حقیقت انسانی ذہن کی بنائی ہوئی دویوں سے بلند ہے اور وہ ایک ایسی وحدت ہے جو تمام صفات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دوسری جہت ”بو قلمونی کو گنوائے بغیر“ کے تصور سے متعلق ہے، جو اس بات کو واضح کرتی ہے کہ وحدت کا مطلب رنگارنگی کو مٹانا نہیں بلکہ اسے ایک اعلیٰ تر ہم آہنگی میں جذب کرنا ہے۔ یہ کثرت کے مٹ جانے کے بجائے اس کی بقا اور ترتیب کا پیغام دیتی ہے۔ تیسری اور سب سے اہم جہت انسانی ادراک کی نفسیات ہے۔ یہاں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حقیقت مطلق ہمارے ذاتی باطن کے آئینے میں عکس بند ہوتی ہے۔ محبت کرنے والے کو اس میں رحمت دکھائی دیتی ہے، ظالم کو قہر، عقل مند کو حکمت، اور سادہ دل کو معجزہ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصل سوال ”خدا کیا ہے؟“ نہیں بلکہ ”میں خدا میں کیا دیکھ رہا ہوں، اور کیوں؟“ ہے۔ یہ ”کیوں“ ہماری داخلی کیفیت، اخلاقی حالت اور روحانی پاکیزگی سے جڑا ہوا ہے۔ صوفیہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نظر کی درستی اور دل کی صفائی کے بغیر حقیقت کا صحیح ادراک ممکن نہیں۔ پچھلے مباحث میں جن منازل سلوک (شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت) کا ذکر آیا تھا، یہ اقتباس ان کا فکری حاصل پیش کرتا ہے۔ یعنی حقیقت کے در پر پہنچ کر سالک کو کائنات کی ہر رنگارنگی ایک ایسی وحدت میں جذب دکھائی دیتی ہے جو نہ صرف رحمت باطنی ہے بلکہ انسان کو جلال و جمال کے درمیان توازن کے ساتھ زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

صوفیانہ تاریخ میں مرشد اور مرید کا رشتہ محض رہنمائی اور پیروی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ ایک باطنی اور روحانی سفر کا گہرا ربط بن جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ تعلق اتنا گہرا اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اصل رہنما کون ہے اور سیکھنے والا کون۔ رومی اور شمس تبریزی کا تعلق اسی نوعیت کا ایک منفرد روحانی تعلق تھا، جس میں دونوں نے ایک دوسرے کی باطنی دنیا کو بدل ڈالا۔ شمس کی آمد نے رومی کی زندگی کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ایک مدرس اور فقیہ سے ایک عاشق اور عارف تک کا سفر۔ لیکن اس تعلق کی گہرائی میں ایک ایسا پہلو بھی ہے جو عام طور پر کم بیان ہوتا ہے: شمس کا اپنا کردار اور ان کا مقصد۔ جہاں رومی نے محبت اور عرفان کو شعری زبان میں امر کر دیا، وہاں شمس ایک واضح اور عملی مشن کے تحت سرگرم نظر آتے ہیں۔ اس اقتباس میں اسی تعلق کی پیچیدگی اور شمس کے کردار کی سنجیدگی کو بیان کیا گیا ہے، جو محض جذباتی وابستگی سے بڑھ کر ایک باقاعدہ روحانی منصوبہ تھا:

”پھر شاہ نسیم میرے بابا کے معشوق یا پیارے مرشد تھے، وہ ہستی جو انہیں خدا تک لے کر جاتی۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ وہ میرے بابا کے لیے اتنے اہم تھے اور رومی، شمس کو کیوں نہ چھوڑ سکے؟ لیکن شمس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟ بے شک اس کے نزدیک بھی رومی کی یہی اہمیت ہوگی۔ یہ کس قدر پیچیدہ مسئلہ لگ رہا تھا: عاشق کون تھا اور معشوق کون؟ گرو کون تھا اور مرید کون؟ لیکن شمس، رومی کی طرح اپنے احساسات کو اس قدر خوب صورتی کے ساتھ الفاظ میں بیان نہیں کر سکے۔ انہوں نے پیار کی زیادہ بات کی اور نہ ہی وہ بے خودی کی کیفیت سے مغلوب ہوئے۔ وہ جیسے بھی تھے، رومی کی طرح شاعر نہ تھے۔ اس کے برعکس لگتا ہے کہ ان کا کردار ایسا تھا جیسے وہ کسی مشن پر ہوں۔ وہ ہمیشہ اس مقدس فریضے کے بوجھ تلے دبے رہتے تھے اور انہوں نے پکارا وہ کیا ہوا تھا کہ وہ اس مشن کو مکمل کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ مشن بالکل واضح تھا: اسے ایک عام عالم دین کو جو محمد جلال الدین کہلاتا تھا، علماء سے الگ کرنا اور انہیں اس معجزاتی مولانا کے سانچے میں ڈھالنا تھا جن کے الفاظ صدیوں تک زندہ رکھے جائیں، اور ان کا مشن تھا کہ اس مقدس آدمی کی پنہاں روح کو پلخ کی گہرائیوں سے اوپر اٹھانا۔“ (۱۳)

مرشد-مرید تعلق کے اس پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جو محض ذاتی عقیدت تک محدود نہیں، بلکہ ایک واضح روحانی نصب العین سے جڑا ہوا ہے۔ یہاں "شاہ نسیم" بطور تمثیل شمس تبریزی کی علامت بننے ہیں، جو اپنے مرید کو محض ذاتی محبت یا جذباتی وابستگی کے ذریعے نہیں، بلکہ ایک شعوری اور منصوبہ بند مشن کے ذریعے بدلتے ہیں۔ اس تعلق میں رومی اور شمس کے مابین ایک باہمی انحصار دکھائی دیتا ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے روحانی راستے کے اہم ستون ہیں، مگر ان کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ رومی کا اسلوب شاعرانہ، عشق آلود اور وجدانی ہے، جب کہ شمس کا انداز سنجیدہ، خاموش اور مقصدی ہے۔ شمس کی توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ ایک روایتی فقیہ اور عالم دین کو ایک ایسے عارف اور صوفی شاعر میں ڈھال دیا جائے جس کی فکر اور الفاظ آنے والی صدیوں تک انسانی قلوب کو منور کرتے رہیں۔ یہ اقتباس یہ بھی واضح کرتا ہے کہ صوفیانہ تاریخ میں بعض شخصیات محض روحانی رہنما نہیں ہوتیں بلکہ روحانی معمار ہوتی ہیں۔ وہ نہ صرف مرید کی ظاہری زندگی بلکہ اس کی باطنی شناخت کو بھی ایک نئے قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔ یہاں "پلخ کی گہرائیوں سے اوپر اٹھانا" محض جغرافیائی حوالہ نہیں بلکہ اس باطنی ارتقاء کی علامت ہے، جو مرید کو فکری اور روحانی سطح پر بلند ترین مقام تک پہنچا دیتا ہے۔

ناول میں کیرن کا کردار ایک مغربی خاتون کا ہے جو بظاہر ایک انشورنس کیس کی تحقیق کے لیے تونیا آتی ہے، لیکن دراصل وہ اپنے باطن کی گم شدہ پہچان اور روحانی سچائی کی تلاش میں ہے۔ ناول کا عنوان، جو "راز کے دروازے" کی

طرف اشارہ کرتا ہے، اسی داخلی سفر اور مکاشفے کی علامت ہے۔ کیرن کی تلاش محض مادی حقائق تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ مولانا جلال الدین رومی اور شمس تبریز جیسے روحانی اکابرین کے تعلقات کے پوشیدہ اسرار کو سمجھنے کی جستجو میں آگے بڑھتی ہے۔ اس سفر میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب وہ شمس تبریز کو بارگاہِ الہی میں نہایت عاجزی اور گہرے عشق سے بھرپور دعا کرتے ہوئے سنتی ہے:

”اے آسمان اور زمین کے خالق، اے ناممکن کو ممکن بنانے والے، میں تجھ سے درخواست

کرتا ہوں کہ تو اپنی مخفی معشوقوں میں سے ایک کا نام مجھے بتادے۔“ (۱۴)

یہ دعا تصوف کی اس روایت کا آئینہ ہے جس میں عشقِ الہی کو مجازی انداز میں بیان کر کے سالک کے قلبی و روحانی جذبے کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ شمس تبریز کی یہ التجا اس شدید تڑپ اور روحانی جستجو کی عکاس ہے جو ایک عاشقِ حق کو محبوبِ حقیقی کی تجلیات میں کھوج کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ کیرن کے لیے یہ لمحہ چونکا دینے والا ہوتا ہے، کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ شمس تبریز کوئی عام درویش نہیں بلکہ اس کے خوابوں اور تلاش کے پردے ہٹانے والے حقیقی رہنما ہیں۔ ابتدا میں کیرن رومی اور شمس کے تعلق کو محض ایک صوفی سلسلے کے پیرومرید کے رشتے کے طور پر دیکھتی ہے، مگر وقت کے ساتھ اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ تعلق عام روحانی نسبتوں سے کہیں زیادہ عمیق اور ہمہ گیر ہے۔ اس احساس کو مزید تقویت اس وقت ملتی ہے جب ناول میں ایک موقع پر شمس تبریز، مولانا روم سے عمدہ شراب لانے کی خواہش کرتے ہیں۔ ایک ایسی آزمائش جو بظاہر شریعت سے متصادم دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت میں یہ سالک کے باطن کی آزمائش اور روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس موقع پر مولانا روم کا جواب تصوف کے کمال اور روحانی معراج کو نمایاں کرتا ہے:

”شیخ وہ نہیں ہوتا جو خود ایمان لائے بلکہ شیخ وہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے ایمان لائیں۔

شیخ وہ نہیں ہوتا جو تشریح کرے بلکہ وہ ہوتا ہے جو کر کے دکھائے۔ وہ نہیں جو سکھائے بلکہ وہ

جو پردہ اٹھادے۔ تم نے میری آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ تم نے مجھے میری اصل حقیقت

سے روشناس کروایا ہے کہ میں ہوں کون۔ تم شیخ ہو، آقا ہو، سچے دوست ہو، سچائی ہو۔“ (۱۵)

یہ مکالمہ مولانا رومی کے روحانی ارتقا کی انتہا اور شمس تبریز کی درویشانہ بصیرت کا حسین امتزاج ہے۔ یہ لمحہ کیرن کے فکری اور روحانی شعور میں ایک انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اب وہ سمجھنے لگتی ہے کہ حقیقی رہبر وہی ہوتا ہے جو محض الفاظ میں تعلیم نہ دے بلکہ سالک کے دل سے جہالت کے پردے ہٹا کر اسے حقیقتِ مطلقہ سے ہم آغوش کر دے۔ یوں بابِ اسرار محض ایک داستان نہیں بلکہ عشقِ حقیقی، قربِ الہی اور مرشد و مرید کے تعلق کی ایک نئی اور گہری تعبیر پیش کرتا ہے، جو قاری کو بھی اپنے اندر جھانکنے اور سچائی کی تلاش میں نکلنے کی دعوت دیتا ہے۔

ناول کی فکری جہتوں میں ایک نمایاں پہلو مولانا جلال الدین رومی کے تصوف اور ان کی تعلیمات کا بیان ہے،

جنہیں مصنف نے کرداروں کے مکالمات کے ذریعے نہایت خوب صورتی اور فنکارانہ نزاکت کے ساتھ قاری تک پہنچایا ہے۔ مرکزی کردار کیرن، جو ایک غیر مسلم مغربی خاتون ہے، بظاہر رومی اور شمس تبریزی کے تعلقات کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے قونیہ آتی ہے، مگر درحقیقت یہ سفر اس کے لیے ایک باطنی تلاش اور خود شناسی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ قونیہ کا یہ سفر اس کے ظاہری مشن سے زیادہ اس کی روحانی مراجعت اور قلبی کشف کا سفر ہے۔ اس دوران کیرن کی ملاقات مختلف شخصیات سے ہوتی ہے جو رومی کی فکر اور تصوف کی عملی تعبیر کا نمونہ ہیں۔ ان ملاقاتوں میں ایک اہم مقام وہ ہے جب مسٹر فیدان، رومی کے حیات و مہمات کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کیرن سے کہتے ہیں:

”رومی عقیدے کے مطابق، لوگ مرتے نہیں بس خاموش ہو جاتے ہیں۔ مردہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو بس اپنی زبان بند کر لیتے ہیں لیکن وہ ہمارے درمیان ہی رہ رہے ہوتے ہیں۔ جہاں تک خدا کے بندوں کا تعلق ہے جنہوں نے عظیم راز مکشف کیے ہوتے ہیں، شمس کی طرح، کسے خبر کے قیامت کے پیامبر، عظیم فرشتے اسرافیل کے صورت پھونکنے سے پہلے وہ کتنی دفعہ ہمارے درمیان ظہور پذیر ہو چکے ہوں، وہ صرف انھی کے لیے اپنی خاموشی کو توڑتے ہیں اور انھی سے بات کرتے ہیں جن کی وہ حمایت کرتے ہیں۔“ (۱۶)

یہ اقتباس صوفیانہ تصور حیات کا گہرا عکاس ہے، جہاں موت کو عدم یا اختتام نہیں بلکہ ایک کیفیت سکوت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہاں زندگی اور موت کے مابین فرق محض جسمانی نہیں بلکہ شعور کی بیداری اور روحانی مکاشفے کی نوعیت کا ہے۔ اس نظریے کے مطابق، وہ روحانی شخصیات جو حقیقتِ مطلقہ کے اسرار سے پردہ اٹھا چکی ہوتی ہیں، اپنی روحانی موجودگی کے ذریعے رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھتی ہیں۔ یہ مکالمہ نہ صرف مرشد کی دائمی روحانی تاثیر کو اجاگر کرتا ہے بلکہ قاری کو اس فکری اور روحانی تسلسل کا ادراک بھی کراتا ہے جو صوفی روایت میں زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہو کر جاری رہتا ہے۔

المختصر مذکورہ ناول محض ایک کرائم تھرلر نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت فکری و روحانی تخلیق ہے جو قاری کو بیک وقت تفریح، فکری غور و فکر اور روحانی مکاشفے کے تینوں پہلو فراہم کرتا ہے۔ اس میں مصنف نے مشرقی تصوف، بالخصوص مولانا جلال الدین رومی اور شمس تبریزی کی روحانی روایت، کو نہایت خوبصورتی سے مغربی شعور و جستجو کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ اس امتزاج نے نہ صرف دو مختلف تہذیبی و فکری دنیاؤں کے بیچ ایک فکری پل قائم کیا ہے بلکہ قاری کو اس پل پر چل کر اپنے باطن کی دنیا میں جھانکنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ ناول کی سب سے نمایاں خوبی اس کا مرکزی کردار کیرن ہے، جو ابتدا میں محض ایک مغربی معاشرت کی نمائندہ نظر آتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ایک گہری روحانی واردات کا تجربہ کرتی ہے۔ اس سفر میں وہ انسانِ کامل، وحدتِ وجود، درویشی، نفس کی مخالفت اور خدا کی صفات جیسے بنیادی

صوفیانہ تصورات سے روشناس ہوتی ہے۔ مصنف نے علامتی اشیاء جیسے سماع، نی، خرقة، تنورہ اور سکے کو کہانی میں اس انداز سے برتا ہے کہ یہ صرف ثقافتی علامتیں نہیں رہتیں بلکہ ان کے پس منظر میں موت و حیات، فنا و بقا اور قرب الہی جیسے گہرے روحانی مفاہیم اجاگر ہوتے ہیں۔

یہ ناول فرد اور خدا کے تعلق کو محض عقلی بحث تک محدود نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کو روحانی مجاہدے اور نفس کی مخالفت کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ شمس تبریز کا یہ پیغام کہ ”سب سے بڑی جنگ انسان اپنے نفس کے خلاف لڑتا ہے“ اس تخلیق کا مرکزی نکتہ ہے، جو نہ صرف کیرن کے کردار میں ڈھلتا ہے بلکہ قاری کو بھی اپنی ذات کے محاسبے پر مجبور کرتا ہے۔

مجموعی طور پر باب اسرار ایک ایسا بیانیہ ہے جو مذہب اور روحانیت کو عصر حاضر کے فکری تناظر میں پیش کرتا ہے۔ یہ محبت، برداشت، تسلیم اور خود شناسی پر مبنی ایک عالمگیر پیغام فراہم کرتا ہے، جو موجودہ دور کے فکری انتشار اور روحانی خلا میں ایک مضبوط رہنمائی کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا اصل کمال یہ ہے کہ یہ قاری کو رومی کے محض اشعار تک محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ اس کے فکر و فلسفے کو عملی اور قلبی سطح پر محسوس کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ احمدت امیت، باب اسرار، مترجم: محمد شفیق، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۴
- ۲۔ Kara, S., *Mystical Dualities in Contemporary Turkish Fiction: A Study on Ahmet Ümit's Bab-ı Esrar*, *Journal of Turkish Literature and Culture*, Istanbul, ۲۰۱۷, pp. ۴۵-۶۲.
- ۳۔ Tüfekçioğlu, F., *Mysticism and Narrative Structure in Ahmet Ümit's Bab-ı Esrar*, *Turkish Studies*, Ankara, ۲۰۱۹, pp. ۲۲۱۷-۲۲۳۴. <https://doi.org/10.۷۷۸۷/TurkishStudies.۱۴۸۷۱>
- ۴۔ احمدت امیت، باب اسرار، ص ۵۴
- ۵۔ Tüfekçioğlu, F., *Mysticism and Narrative Structure in Ahmet Ümit's Bab-ı Esrar*, pp. ۲۲۱۷-۲۲۳۴.
- ۶۔ احمدت امیت، باب اسرار، ص ۵۵
- ۷۔ Kara, M., *Sufi Rituals and Symbolism in Bab-i Esrar*, in *Mysticism in Contemporary Turkish Fiction*, Routledge, London, ۲۰۱۷, p.

۲۸.

۸۔ اجمت امیت، باب اسرار، ۱۲۳

Kara, M., Sufi Rituals and Symbolism in Bab-i Esrar, in ۹
Mysticism in Contemporary Turkish Fiction, Routledge, London, ۲۰۱۷, p.

۳۱.

۱۰۔ اجمت امیت، باب اسرار، ۵۵

Schimmel, A. (۱۹۷۵). Mystical Dimensions of Islam. Chapel Hill: ۱۱

University of North Carolina Press. P ۹۹

۱۲۔ اجمت امیت، باب اسرار، ص ۲۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۷۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۷